

شادم از زندگى خویش

۳۰ جون ۲۰۰۴

ان دنوں میری دوست ارجمند آرا میرے ہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔ انہوں نے میری آپ بیتی کے پہلے حصے کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ گو یہ بہت ہی عمدہ ترجمہ ہے، اُن کو انگریزی متن کو سمجھنے میں کہیں دشواری بھی پیش آئی ہے۔ اگرچہ پہلی ہی نظر میں یہ ترجمہ مجھے اچھا لگا، پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ اگر ہم ساتھ بیٹھ کر پورے ترجمے کو شروع سے آخر تک دیکھیں تو یہ بہت مفید ہو۔ اس لیے میں نے اُن کو یہاں بلایا اور ہم نے ۹ جون سے ۲۹ جون تک بیس دن کی مدت میں سارے متن پر نظرِ ثانی کرلی اور اسے آخری شکل دے دی۔

ارجمند آرا کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے کا یہ تجربہ میرے لیے بہت ہی دلچسپ تھا۔ شروع ہی میں میں نے محسوس کیا کہ اب تک جن لوگوں سے مجھے اردو میں گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا وہ سب عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ ان کی نسل کی اردو سننے میں مجھے بڑا لطف آیا۔ کچھ الفاظ کے معنی جو میں پہلے سے جانتا تھا لیکن تقریباً بھول چکا تھا، ان کو دوبارہ سیکھنے کا موقع ملا۔ کافی الفاظ ایسے بھی سیکھے جو میں نہیں جانتا تھا لیکن آج کی بول چال میں بالکل عام ہیں۔ اُن کو ۶ جولائی کو ہندوستان واپس جانا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے جانے کے بعد ان باتوں میں سے کافی ایسی ہوں گی جو میں پھر بھول جاؤں گا، لیکن ان دنوں اُن کی وجہ سے مجھے کافی فائدہ ہوا اور کافی لطف بھی آیا۔

ارجمند آرا دہلی یونیورسٹی میں اردو کی لیکچرر ہیں اور وہاں نومبر ۲۰۰۲ سے پڑھا رہی ہیں۔ شعبے میں تعلیم کے ماحول اور معیار کے بارے میں میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے صاف گوئی سے بتایا کہ تعلیمی صورتِ حال خاصی شرمناک ہے۔ شمالی

ہندوستان میں اردو جس تیزی سے ختم ہوئی ہے اور معیاری اردو جاننے والوں کی تعداد گھٹتی ہے اس کے نتیجے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں اردو میں ایم۔ اے۔ کے لیے آنے والے طالب علموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ چار جملے نہ تو درست بول سکتے ہیں، نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ شعبے کے استاد بھی ان کی تربیت کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی ذمہ داری نبھانے میں بھی پوری طرح کوتاہی برتتے ہیں۔ اکثر سینئر استاد اور پروفیسر کلاس لینے کو شاید کسرِ شان سمجھتے ہیں اور ان میں سے کئی تو ایسے ہیں جن کا لیکچر سننے کی سعادت طالب علموں کو پورے سال نصیب نہیں ہوتی۔ ارجمند نے بتایا کہ دہلی یونیورسٹی میں ہر ڈپارٹمنٹ کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں۔ تعلیمی اداروں کو یہ اختیارات دینا بہت خوش آئند بات ہے لیکن یہ اختیارات اگر مفاد پرستوں کے ہاتھ میں چلے جائیں اور نتیجہ ایسے ہی بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہو جیسا کہ شعبہ اردو میں ہوا ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ارجمند نے بتایا کہ دہلی یونیورسٹی میں ہر شعبے کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں۔ مثلاً داخلے کی پالیسی وضع کرنے، نصاب کی تعیین، اس میں ترمیم و اضافہ، نئے کورس متعارف کرانے کے اختیار وغیرہ میں یونیورسٹی انتظامیہ کا کوئی خاص دخل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ پالیسی وضع کرنے کے بعد متعلقہ شعبہ اپنی فیکلٹی کی کمیٹی آف کورسز سے اسے منظور کرا کے توثیق کے لیے یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل میں بھیج دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شعبہ اردو کو بھی یہ اختیارات حاصل ہیں لیکن ان اختیارات کا ایسا استعمال نظر نہیں آتا جس کا کوئی خاص مثبت اور تعمیری اثر پڑتا ہو۔ اس کے علاوہ دہلی کے کالجوں میں جہاں جہاں بی۔ اے۔ کی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام ہے، اساتذہ کے تقرر میں شعبہ اردو کا نمایاں رول ہوتا ہے۔ کالجوں میں اردو نصاب بھی آرٹس فیکلٹی کا شعبہ اردو ہی طے کرتا ہے۔ دہلی کے کالج ایم۔ اے۔ میں داخلہ دینے کے تو مجاز ہیں لیکن طالب علموں کو کلاس کرنے کے لیے اپنے اپنے مضامین کے شعبوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یونیورسٹی کے شعبے نہ صرف خاصے خود مختار ہیں بلکہ ایک حد تک انہیں اکیڈمک بالادستی بھی حاصل ہے۔ تعلیمی اداروں میں ریسرچ کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اس طرح کے اختیارات ضرور ملنے چاہیں لیکن یہی اختیارات اگر مفاد پرستوں کے ہاتھ میں چلے جائیں تو نتیجہ خاصے تباہ کن ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی یونیورسٹی کے

شعبۂ اردو کو لیا جا سکتا ہے جو ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔ یہاں ایم۔ اے۔ کی تعلیم سیمسٹر سسٹم کے مطابق دی جاتی ہے۔ چونکہ شعبہ کسی کے تئیں جوابدہ نہیں ہے اس لیے پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ شعبہ کوئی اکیڈمک کلینڈر تک نہیں بنا سکا۔ یہاں داخلہ دینے کی بھی کوئی مستقل پالیسی نہیں ہے۔ صدر شعبہ کے بدلنے کے ساتھ پالیسی میں بھی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اور نئے صدر کی فہم اور مرضی کے مطابق شعبہ چلتا ہے۔ شعبے کی اپنی کوئی ریسرچ لائبریری تک نہیں ہے۔ اس کی تحویل میں بس اتنی ہی کتابیں ہوں گی کہ ایک شیلف میں سما سکیں۔ سنتے ہیں کہ شعبے کے پہلے صدر خواجہ احمد فاروقی نے بہت سے نادر اور نایاب مخطوطات جمع کیے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس میں صرف یہی اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اب شعبے میں ان میں سے ایک بھی مخطوطہ موجود نہیں ہے۔ خدا معلوم کس کس کی ذاتی لائبریریوں کی زینت بنے ہوں گے۔ گزشتہ برس پی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے شعبے میں لائبریری قائم کرنے کے لیے یا کتابوں کی خریداری کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کی گرانٹ منظور کی تھی۔ شعبے نے ایک کوڑی کی بھی کتابیں نہیں خریدیں اور سارا پیسا واپس ہو گیا ہوگا۔

اسی طرح غیر اردو داں لوگوں کو اردو زبان سکھانے کے جو سرٹیفیکیٹ اور ڈپلوما کورس دہلی یونیورسٹی کا اردو شعبہ چلاتا ہے، ان کا نصاب بھی بہت ناقص ہے۔ یہ نصاب جو شعبے ہی نے تیار کیا ہے، املے کی اغلاط سے پُر ہے۔ اوسطاً ہر سطر میں ایک غلطی نکل آئے گی۔ مشہور و معروف اشعار تک میں اغلاط راہ پا گئی ہیں۔ اور تو اور، اس کی بھی مثالیں مل جائیں گی کہ ایک ہی غزل کے دو الگ الگ مصرعوں کو ایک شعر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ سرٹیفیکیٹ کورس کی کتاب میں بہت سے اردو الفاظ کے غلط انگریزی متبادل دیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر ہر ٹیچر کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے۔ گزشتہ چار سال سے یہ کتابیں ان تمام اغلاط کے ساتھ پڑھائی جا رہی ہیں، اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود شعبے کے ارباب اختیار اس پر نظر ثانی کے لیے تیار نہیں۔ کورس کی ضرورتوں کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو ان کتابوں میں شامل بہت سے مضامین کے معیار اور انتخاب کی بنیادوں پر بھی سوالیہ نشان لگایا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ وہ طالب علم جو اردو زبان و ادب کی کشش میں رسم خط سیکھنے کے لیے ان کورسوں میں داخلہ لیتے ہیں، اس قسم کے مایوس کن تجربات کے بعد اپنی دل چسپی

شاید ہی برقرار رکھ پاتے ہوں۔

ارجمند کا یہ بھی خیال ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی بنیاد ہی میں کجی ہے۔ جب شعبہ قائم ہوا تھا، اُس کے پہلے صدر خواجہ احمد فاروقی نے جمہوری روایات اور آزادی اظہار کے ماحول کو پنپنے نہیں دیا۔ نتیجے کے طور پر یہاں ان کے اور دوسرے اساتذہ کے درمیان رشتے برابری کے نہیں رہے۔ ان کا رویہ سرپرستانہ رہا اور آئندہ کے لیے باقی اساتذہ نے بھی اسی رویے کو معیار سمجھا۔ یہاں استادوں کے تقرّر میں ان کی صلاحیتوں سے زیادہ ارباب اختیار کی خوشنودی کو دخل رہا۔ یہ روایت کہیں ۲۰۰۲ میں جا کر ٹوٹی ہے، جب چار نئے لیکچررز کا تقرّر کچھ ایسے حالات میں ہوا کہ شعبے کے کسی استاد کی مرضی نہ چل سکی اور وائس چانسلر نے تقرّر کے سارے تکنیکی معاملات پر نظر رکھی اور انٹرویو بورڈ میں دو دن تک خود موجود رہا۔

ویسے عمومی طور پر اردو شعبوں کا حال بیشتر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کافی خراب ہے اور اساتذہ کی لاعلمی اور نکتے پن کے جتنے قصے مشہور ہیں ان میں شاید کوئی مبالغہ نہیں۔

کل رات کو کسی وجہ سے میرے ذہن میں ایک شعر آیا جو ایک زمانے میں عابد حسین صاحب نے مجھے سنایا تھا۔ شعر عندلیب شادانی کے بارے میں تھا:

عندلیبِ شادانی تیرا دم غنیمت ہے
تیرے دم سے میرا دم کچھ ہی کم غنیمت ہے

یہ سنہ ۱۹۵۸ کی بات تھی جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھا اور اس زمانے میں عابد حسین اور ان کی بیوی صالحہ دونوں وہاں تھے۔ میں نے ان کی اور باتیں یاد کرنی شروع کیں اور سوچا کہ ان کو بھی قلم بند کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں میں میر انیس کی شاعری کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ہم میں یہ طے پایا کہ صالحہ عابد حسین اس میں میری مدد کریں گی اور اس کے بدلے میں ان کو انگریزی بولنے کی مشق کرائیں گا۔ انیس کا مطالعہ کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ وہ پڑھ کر سناتی تھیں اور جہاں مجھے سمجھنے میں دقت ہوتی میں ان کو روکتا تھا اور وہ مجھے سمجھاتی تھیں۔ کبھی کبھی عابد حسین اس کمرے میں

نکل آتے تھے اور کبھی کبھی محسوس کرتے تھے کہ صالحہ کے کسی اردو لفظ کا تلفّظ ان کے نزدیک فصیح نہیں ہے۔ ایسے موقعوں پر مجھے یاد ہے کہ صالحہ کہتی تھیں کہ میں نے تو یہی تلفّظ سنا ہے، اس پر عابد حسین کہتے، ”پانی پت میں یہی تلفّظ ہوگا،“ اور ہم سب ہنستے تھے۔ جیسا کہ شاید آپ کو معلوم ہے، صالحہ، حالی کے خاندان سے تھیں اور پانی پت حالی کا وطن تھا۔ ان دنوں عابد حسین سے میری اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن پھر بھی ان سے کوئی بہت قریب کا تعلق پیدا نہیں ہوسکا۔

پھر میں سوچنے لگا کہ عابد حسین، ذاکر حسین اور محمد مجیب جو گویا ایک ہی حلقے کے افراد تھے، ان کو بھی میں جانتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ قریب کا تعلق ذاکر حسین سے تھا۔ جب میں پہلی بار، نومبر سنہ ۱۹۴۹ میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گیا تو وہ وائس چانسلر تھے۔ سنہ ۱۹۵۸ میں جب میں دوسری بار گیا تو وہ علی گڑھ چھوڑ چکے تھے اور اب بہار کے گورنر تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں بلایا اور میں کچھ دن انہی کے ہاں ٹھہرا۔ انہوں نے یہ حکم دیا کہ ناشتے پر صرف وہ اور میں ساتھ بیٹھیں اور باتیں کریں۔ اُس زمانے میں میں اور خورشید الاسلام اپنی کتاب *Three Mughal Poets* لکھ رہے تھے۔ میں نے ان کو اپنے مسوئے کے کچھ حصے دکھائے، جو انہیں بہت پسند آئے۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ ہمارے کام کو اہم سمجھتے ہیں اور برابر ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ بعد میں بھی جب وہ ہندوستان کے نائب صدر ہو گئے تھے تو میں دہلی میں ان سے جا کر ملا۔ وہ ہر دفعہ کہتے تھے کہ جب بھی آپ کا جی چاہے، مجھ سے آکر ملیے۔ ان کے بارے میں اور بھی یادیں ہیں جن کی بابت میں غالباً پھر کبھی لکھوں گا۔

ذاکر حسین اور عابد حسین کے مقابلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مجیب صاحب سے مجھے زیادہ ملنے اور گفتگو کرنے کے موقعے ملتے تھے۔ میں جب بھی جامعہ جاتا تھا، اپنے پرانے دوست سجاد علی (جن کو سبھی سجاد صاحب کہتے تھے اور غالباً ان کے پورے نام سے واقف بھی نہیں تھے) کے گھر قیام کرتا تھا۔ میں ان سے پہلی بار ۱۹۴۹ میں ملا یا شاید سنہ ۵۰ کے شروع میں۔ اس زمانے سے آج تک ہماری بہت پکی دوستی ہے۔ جب میں مجیب صاحب سے ملنے جاتا تو عام طور پر سجاد صاحب بھی میرے ساتھ جاتے تھے۔ اور حالانکہ سجاد جب پہلی بار جامعہ پہنچے تو وہ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ جامعہ ملیہ کی پرانی روایت کے مطابق

احمد کی کتاب ہے، اور جو بہت اچھی کتاب ہے ("اقبال، نئی تشکیل")، اس میں آپ اس کا ذکر نہیں پائیں گے۔

میرے بعض انگریزی کلیگ بھی ہیں جن کے اس طرح کے الفاظ مجھے بہت پسند آئے۔ ایک صاحب ہیں جان پیرسن جو SOAS میں ہندوستان کی تاریخ پڑھاتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ بعض انگریز مورخ ایسے ہیں جو سوچتے ہیں کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستانی، اردو میں یا تمل میں مہمل جملے بولتے رہے اور اس انتظار میں تھے کہ انگریز آئیں اور تاریخ شروع ہو جائے۔ یہ بھی بہت عمدہ "فتویٰ" ہے۔ ایک اور کلیگ ٹیری بائرز تھے، جو میرے بہت اچھے دوست تھے اور ہیں۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ ہمارے SOAS میں جو لوگ ہندوستانی تاریخ پڑھاتے ہیں، آپ ان کو دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک خانے میں وہ لوگ آتے ہیں جنہیں برابر اس کا افسوس رہتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ اور دوسرے خانے میں وہ لوگ آتے ہیں جنہوں نے آج تک یہ محسوس نہیں کیا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ یہی صاحب، یعنی ٹیری، اُن لوگوں کے بارے کہتے تھے جن میں کوئی خوبی نہیں ہوتی، "وہ تو ٹھیک ہی آدمی ہے۔ وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو سکے۔ بس علاج صرف اتنا ہے کہ ایک رائفل لیں اور ان کی آنکھوں کے بیچ میں گولی مار دیں۔" ٹیری بائرز کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب SOAS کے حکام نے بالکل ناجائز طور پر ہپل داس گپتا کو اکنامکس کے ڈپارٹمنٹ سے نکالا تو ہم نے ان کی حمایت میں ایک زبردست مہم چلائی جس میں میرے ساتھ پیش پیش ٹیری بائرز ہی تھے۔ ان دنوں ان کے صدر شعبہ نے تنبیہ کی اور کہا کہ آپ شور کیوں مچاتے رہے ہیں، اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا (اشارہ ان کی ترقی روکنے کی طرف تھا)۔ ٹیری نے جواب دیا، "میں اس لیے شور مچا رہا ہوں کہ جب میں صبح کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بناتا ہوں تو میں نہیں چاہتا کہ اپنا چہرہ دیکھ کر مجھے اُلٹی ہو جائے۔"

علی گڑھ میں میرے ابتدائی دنوں کے بارے میں کچھ یادیں بہت واضح ہیں۔ اس زمانے میں خلیل الرحمان اعظمی ایم۔ اے۔ کے طالب علم تھے۔ وہ ہر روز تپتی سہ پہر میں میرے پاس آتے تھے اور مجھے پریم چند کا ناول "گنودان" پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی رکتے تھے اور کہتے تھے،

”آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ میں آپ کو پڑھا رہا ہوں۔ اس لیے کہ پریم چند پورب کے آدمی تھے اور میں بھی پورب کا ہوں۔ پریم چند کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کے معنی صرف پورب کے لوگ جانتے ہیں۔“

علی گڑھ کے ایک اور صاحب جن کی بعض یادیں بہت تازہ ہیں اختر انصاری تھے۔ (انہی کی ”ایک ادبی ڈائری“ کے نمونے پر میں نے ”شادم از زندگی خویش“ لکھنا شروع کیا۔) وہ شعبۂ اردو میں لیکچرر تھے اور صدر شعبہ رشید احمد صدیقی نے ان سے میری مدد کرنے کو کہا تھا۔ انگریزی پر اپنے عبور پر وہ بہت فخر کرتے تھے اور ان کا مذاق اُڑاتے تھے جن کی انگریزی بہت ناقص ہوتی تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کسی کے بارے میں کہا، ”اس شخص کی انگریزی دیکھیے۔ اس نے ‘broken English’ کے الفاظ استعمال کیے۔ ظاہر ہے اس نے اردو الفاظ ’ٹوٹی پھوٹی انگریزی‘ کا لفظی ترجمہ کیا جو صحیح انگریزی نہیں ہے۔“ جب میں نے کہا، ”نہیں اختر صاحب، ‘broken English’ بالکل فصیح ہے،“ تو ان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ عام طور پر ان کی رائے اپنے ہم عصر شعرا اور نثر نگاروں کے بارے میں اچھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے ہم عصروں میں کس کس کی اردو نثر اچھی ہے، تو فوراً جواب دیا، ”میری،“ اور کسی دوسرے کا نام نہیں لیا۔ ایک اور موقع پر انہوں نے مجھے اور میری بیوی کورات کے کھانے پر بلایا۔ ان کے ایک دوست بھی مہمان تھے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں اردو سیکھ رہا ہوں تو ان صاحب نے فوراً میری بیوی کی موجودگی میں کہا، ”تو آپ کو طوائف ملازم رکھنی چاہیے۔ صرف اسی طرح آپ بہترین اردو سیکھ سکتے ہیں۔“ ویسے انگریزوں میں یہ تصوّر موجود تھا اور وہ ایسی عورت کو سلیپنگ ڈکشنری (‘sleeping dictionary’) کہتے تھے۔

میں پہلی بار ہندوستان اور پاکستان سنہ ۱۹۴۹ء میں تعلیمی رخصت پر گیا اور آخری بار ۱۹۹۸ء میں۔ اس عرصے میں ظاہر ہے کہ میری بہت سی ملاقاتیں استادوں، شاعروں، نثر نگاروں اور ناول نگاروں وغیرہ سے ہوتی رہیں جن میں سے ایک آدھ نے اوروں کے مقابلے میں مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب ایک دفعہ میں کراچی گیا تو میری ملاقات فرمان فتح پوری سے ہوئی۔ اس سے پہلے میں ان سے اُس وقت ملا تھا جب ہم دونوں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کی کسی تقریب میں بلانے گئے تھے

اور وہ شروع ہی سے مجھے بہت پسند آئے۔ مجھے خاص طور پر ان کا احساسِ ظرافت بہت عمدہ معلوم ہوتا تھا۔ مسکرا کر مجھ سے کہتے تھے، ”آپ کے شاگرد ڈیوڈ میتھیوز...“ حالانکہ خوب جانتے تھے کہ میتھیوز میرے شاگرد نہیں ہیں۔ کراچی میں میں ان کے ساتھ یونیورسٹی گیا۔ ہم یونیورسٹی کے کسی بڑے ہال میں کھڑے تھے اور اردو غزل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میری رائے میں اگر کوئی آدمی مکمل انسان بننا چاہے تو یہ بالکل ضروری ہے کہ وہ عشق کرے۔ انہوں نے فوراً اتفاق کیا اور کہا، ”جی ہاں۔ میں اپنے طالب علموں سے کہتا ہوں کہ عشق کرو -- چاہے اس کھمبے سے کرو،“ اور یہ کہہ کر ستون پر بڑے زور سے ہاتھ مارا۔ میرا تجربہ یہ رہا ہے کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس بنیادی بات کو پہچانتے ہیں۔ ایک بار میں نے عبادت بریلوی سے کہا کہ غزل کا ہیرو عاشق ہے اور عاشق کے دشمن شیخ اور دنیا دار ہیں، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے غزل پر لکھا ہے ان کی بڑی اکثریت یا تو شیخ ہے یا دنیا دار۔ ظاہر ہے کہ فرمان فتح پوری اس خانے میں نہیں آتے۔

یکم جولائی ۲۰۰۴

میری آپ بیتی کے دوسرے حصے میں ۱۹۴۶ سے ۱۹۶۴ تک کے واقعات شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ اس حصے میں بہت سی باتیں ہوں گی جو پاکستان، ہندوستان اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ مجھے ابھی معلوم نہیں کہ یہ حصہ کب چھپے گا۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ واقعات اور تجربے یہاں بیان کروں۔ جب میں ۱۹۴۹ میں علی گڑھ پہنچا تو میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ چونکہ میں ہندوستان میں ساڑھے تین سال رہ چکا ہوں اس لیے مجھے ہندوستان اور ہندوستانی معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ لیکن بہت جلد ہی مجھے اس بات پر غور کرنا پڑا کہ ہندوستان اور ہندوستانی معاشرت کا میں نے صرف ایک محدود حصہ دیکھا ہے۔ ایک تو فوجی زندگی، جو ظاہر ہے عام زندگی سے بہت مختلف ہوتی ہے، اور دوسرے یہ کہ میں ان لوگوں میں رہا ہوں جو جنوبی ہند کے دیہات کے رہنے والے تھے اور میں نے کسی کا گاؤں تو نہیں دیکھا جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے وہ لوگ اور ان کے رشتے دار کس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے۔

پھر شاید اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اب مجھے بالکل دوسرے قسم کے لوگوں کے ساتھ رہنا تھا جو قصبوں اور شہروں کے رہنے والے تھے اور یہ سمجھتے تھے، اور صحیح سمجھتے تھے، کہ وہ دیہاتیوں سے بہت مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں میرے کچھ دلچسپ تجربے ہیں۔ جب میں علی گڑھ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب اسرار اللہ صدیقی وہاں ہیں۔ اسرار سے میری ملاقات لندن میں ۱۹۴۶ میں ہوئی تھی اور ہم اچھے خاصے دوست ہو گئے تھے۔ ایسے دوست جو ایک دوسرے سے تقریباً ہر بات بالکل صاف گوئی سے کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ میں میری تربیت کا کام سنبھالا۔ میری یہ عادت تھی کہ لندن کی سڑکوں پر چلتے ہوئے اگر میں یہ محسوس کرتا کہ مجھے جلدی کرنی چاہیے تو میں دوڑنا شروع کر دیتا اور اکثر چلتے ہوئے سیٹی بھی بجاتا تھا۔ علی گڑھ میں بھی یہی کیا۔ اور ایک دن اسرار نے مجھ سے کہا، ”رالف، سنو۔ یہاں کوئی شریف آدمی نہیں دوڑتا۔ اور کوئی شریف آدمی سیٹی نہیں بجاتا۔“ میں نے کہا اچھی بات ہے۔ اگر یہ ہے تو میں فوراً دوڑنا اور سیٹی بجانا چھوڑ دوں گا۔ ایک اور موقع پر جب میں سول لائنز سے، جہاں میں اور میری بیوی ٹھہرے ہوئے تھے، یونیورسٹی جا رہا تھا تو راستے میں ایک جوان عورت ملی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے دل میں کہا کہ عام طور پر عورتیں آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں ہیں، مسکرانا تو درکنار، اور اب ایک ایسی عورت ملی جو یہ جانتی ہے کہ انسان کو انسان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ میں نے اسرار کو یہ بات بتائی تو انہوں نے فوراً کہا، ”وہ رنڈی ہوگی۔“ مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے پوچھا کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ رنڈی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ہندوستان میں کیا کسی اور عورت کو مسکراتے ہوئے دیکھا؟ کوئی شریف عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ پھر اس کے بعد پوچھا، ”کیا کوئی بوڑھی عورت اس نوجوان عورت کے ساتھ تھی؟“ میں نے کہا، ”ہاں تھی۔“ اسرار نے کہا، ”یہ اس کی نائک ہوگی۔“ اور مجھے ماننا پڑا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں صحیح ہے۔

میرا اور میری بیوی کا علی گڑھ پہنچنا بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ (علی گڑھ کے اپنے چند تجربات کا ذکر میں نے اپنے مضمون ”Urdu and I“ میں کیا ہے جو AUS میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ کراچی سے اجمل کمال نے اپنے سہ ماہی رسالے ”آج“ میں شائع کر دیا ہے۔) ہم دونوں کمیونسٹ تھے (اور اب بھی ہیں) اور ہم نے جانے سے

پہلے طے کیا کہ جہاں تک ہو سکے ہم تقریباً اسی طرح زندگی بسر کریں گے جس طرح عام ہندوستانی بسر کرتا ہے۔ اس لیے جب ہم دہلی سے روانہ ہوئے تو ہم دونوں ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بیٹھے۔ ریلوں میں تھرڈ کلاس ڈبے ایک عرصہ پہلے بند ہو چکے ہیں۔ تھرڈ کلاس کی کوچ میں الگ الگ کمپارٹمنٹ نہیں ہوتے تھے بلکہ پوری کوچ میں دونوں طرف لکڑی کی لمبی بینچیں ہوتی تھیں اور بیچ میں ایک ایسی چوڑی بینچ ہوتی تھی جس پر مسافر ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بیٹھ سکتے تھے لیکن ان کی پیٹھوں کے بیچ لکڑی کی ایک ریلنگ ہوتی تھی۔ مسافروں کو تعجب ہوا کہ ایک انگریز اور اس کی بیوی اس ڈبے میں سفر کر رہے ہیں لیکن بہت جلد ہی جب ان پر یہ کھلا کہ میں ان سے اردو میں بات کر سکتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ میرے پاس مونگ پھلیوں کا ایک آدھ لفافہ تھا اور سفر کے دوران میں ان کو سب میں تقسیم کرتا رہا۔ اس طرح سفر بہت اچھا گزرا۔ جب ترین علی گڑھ اسٹیشن پہنچی تو میں نے سوچا کہ اب ہم اتر کر تانگا تلاش کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم ایسا کر سکیں، میں نے دیکھا کہ ایک صاحب خاصے پریشان معلوم ہو رہے ہیں اور لگتا تھا کہ کسی کی تلاش میں ہیں۔ جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو ہمارے پاس آئے اور پوچھا کہ آپ مسٹر رسل ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ تو انہوں نے کہا کہ میں وائس چانسلر کا ڈرائیور ہوں اور گاڑی باہر کھڑی ہے۔ وہ صاحب ہمیں فرسٹ کلاس ڈبے میں تلاش کر کے آچکے تھے۔ یہ بات ان کے تصور میں نہ آ سکتی تھی کہ ایک انگریز تھرڈ کلاس میں سفر کرے گا۔ خیر مجھے حیرت یہ تھی کہ میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی معمولی انگریز لیکچرر کے استقبال کے لیے، جس کا تقرر ابھی ہوا ہے، وائس چانسلر اپنی گاڑی بھیجیں گے۔ اب ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ہمیں وائس چانسلر سے ملنا تھا۔ اس وقت تک ہم نے علی گڑھ میں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ جب یہ بات میں نے ذاکر حسین کو بتائی (ان دنوں وہی وائس چانسلر تھے) تو انہوں نے کہا کہ جب تک آپ انتظام نہ کر سکیں، میرے ہاں ٹھہریں۔ ہم ان کے ہاں تقریباً دو ہفتے ٹھہرے۔ اس کے بعد مجھے اور ذاکر صاحب کو بھی پتا چلا کہ رفعت حسین عثمانی علی گڑھ میں ایک ایسے مکان میں رہتے ہیں جس کی اوپر کی منزل اس وقت خالی تھی۔ رفعت سے بھی میری ملاقات (اسرار کی طرح) پہلے ہی لندن میں ہو چکی تھی، جہاں وہ کمیونسٹ طالب علموں کے ایک گروپ کا ممبر تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہتر انتظام اور کیا ہو سکتا ہے

کہ ہم ان کے گھر جا کر ٹھہریں۔ چنانچہ ہم وہاں گئے اور علی گڑھ میں قیام کی تمام مدت اسی گھر میں رہے۔

رہائش کی تلاش کے پیچھے ایک دلچسپ کہانی ہے۔ لندن میں میری ملاقات نور الحسن سے ہوئی تھی۔ وہ بھی کمیونسٹ تھے اور آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ (نور الحسن بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے)۔ ہندوستان اپنی روانگی سے کچھ دن پہلے میں ان سے جا کر ملا تھا۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ ان کی منگنی نواب رامپور کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ میں نے اپنی سادہ لوحی میں پوچھا کہ کیا وہ بھی کمیونسٹ ہے؟ انہوں نے رک رک کر جواب دیا، ”نہیں تو... لیکن... اس کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے...“ پھر میں نے ان کو بتایا کہ میں علی گڑھ جا رہا ہوں لیکن ابھی وہاں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں کر سکا ہوں۔ انہوں نے کہا، ”فکر نہ کیجیے۔ علی گڑھ میں آپ اور آپ کی بیوی ہمارے ہاں ٹھہریں گے۔“ جب ہم علی گڑھ پہنچے تو میں ان سے ملنے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت شاندار حویلی نما مکان میں رہتے ہیں جس کے چاروں طرف اونچی چہار دیواری ہے۔ میں ان سے ملا تو انہوں نے کوئی وجہ بتائے بغیر مجھ سے کہا کہ مجھے افسوس ہے لیکن آپ ہمارے ہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں نے کہا اچھی بات ہے، تو پھر آپ ہمارے لیے کوئی ایسی جگہ تلاش کر دیجیے جہاں ہم ٹھہر سکیں۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی شمشاد مارکیٹ سے ذرا آگے پیراڈائس ریسٹوران تھا۔ اس کی اوپر کی منزل پر ایک کمرہ خالی تھا۔ نور الحسن ہمیں وہاں لے گئے اور تجویز رکھی کہ آپ یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں کسی بھی طرح کی کوئی سہولت مہیا نہیں ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ نہیں صاحب، ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے، اور ذاکر صاحب کے گھر واپس لوٹ گئے۔ (اندرا گاندھی کے زمانے میں نور الحسن وزیر تعلیم رہے، پھر سفیر بنا کر سوویت یونین بھیجے گئے، اور آخر میں مغربی بنگال کے گورنر بنائے گئے)۔ جب رفعت حسین عثمانی کے گھر میں ہمیں پوری منزل ملی تب جا کر ہمارا مسئلہ حل ہوا۔

۳ جولائی ۲۰۰۴

ان دنوں میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اردو پر جتنا عبور میں نے حاصل کیا وہ رفتہ رفتہ

کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا مجھے افسوس تو ہوتا ہے لیکن زیادہ نہیں۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ بالکل فطری معاملہ ہے۔ میں پچھلی بار ہندوستان اور پاکستان ۱۹۹۸ میں گیا تھا، اور اب کبھی جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ کسی بھی زبان پر عبور تبھی قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا بھی ہے جب آپ کافی لمبے عرصے تک اس زبان کے بولنے والوں میں اور خاص طور پر اہل زبان میں گھرے رہیں۔ اگر اس کا امکان باقی نہ رہے تو بہت سے الفاظ اور جملے جو آپ اچھی طرح جانتے ہیں، رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے پچھلے سال ایک دن میں باہر ٹہل رہا تھا۔ دھوپ تھی لیکن بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مجھے یاد تھا کہ اس طرح دھوپ میں بوندا باندی کو کسی جانور کے بیاہ سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن کس جانور کے بیاہ سے؟ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ کچھ منٹ سوچنے کے بعد خیال آیا کہ شاید جیکال (jackal) ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ جیکال کو اردو میں کیا کہتے ہیں۔ بڑی مشکل سے یاد آیا کہ شاید گیدڑ کہتے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ بعد میں ارجمند نے بتایا کہ گیدڑ کا بیاہ نہیں کہتے، گلہری کا بیاہ کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بعض لوگ گیدڑ کا بیاہ کہتے ہیں اور بعض لوگ گلہری کا۔)

ایک اور بات میں نے اکثر محسوس کی ہے۔ وہ یہ کہ جب انگریز ہندوستان جاتے تھے اور ان کو اردو بولنا سیکھایا جاتا تھا تو سکھانے والے عام طور پر صحیح تلفظ پر کوئی زور نہیں دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو غلط تلفظ انگریز نے سیکھا وہ بعد میں بھی اسی غلط تلفظ کے ساتھ بولتا رہا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا، اور کچھ بہت ہی عام سے الفاظ ہیں جن کے بارے میں مجھے شک ہے کہ میں انہیں صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر پاتا ہوں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ شروع کے دنوں میں انگریز ”دال“ اور ”ڈال“ میں فرق محسوس نہیں کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں اس جگہ کبھی ”ڈال“ کا تلفظ ادا کرتے ہیں جہاں ”دال“ کا ہونا چاہیے۔ اس طرح کی عادت چھوڑنا کافی مشکل کام ہے۔ مجھ سے کبھی کبھی اس طرح کی غلطی ہو جاتی ہے۔

جب میں نے ہندوستان میں خاصی روانی اور خاصی صحت کے ساتھ اردو بولنی شروع کی لوگ میری تعریف کرتے تھے کہ آپ کا شین قاف درست ہے۔ میں اس پر مسکراتا تھا، اس لیے کہ شین کی آواز تو انگریزی میں بھی موجود ہے اور قاف کی آواز اگرچہ انگریزی میں موجود نہیں، لیکن اس کو ادا کرنے میں انگریز کوئی خاص مشکل محسوس

نہیں کرتا۔ ہمارے لیے مشکلیں بالکل دوسری ہیں۔ مثال کے طور پر ”کہ“ کی آواز ہم آسانی سے نکال سکتے ہیں لیکن ”ک“ کی آواز نکالنا اکثر انگریزوں کے لیے کافی مشکل ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ”ب“ کی آواز ہم نکال سکتے ہیں لیکن ”بھ“ کی آواز ذرا مشکل سے ہی۔ میں اب بھی ان باتوں میں کبھی کبھی گڑبڑ کر جاتا ہوں۔ اس کی ایک بہت نمایاں مثال یہ ہے: حال ہی میں میری دوست میرین مالٹینو کا آپریشن ہوا۔ وہ اسپتال کے جس وارڈ میں تھیں، ان کے برابر والے بستر پر ایک عورت تھی جس نے میرین سے کہا، ”ویسے میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھوڑے نے میرے جسم کے ہر حصے پر لات ماری ہو۔“ رات کو میں نے ارجمند کو یہ لطیفہ سنایا۔ دوسرے دن ارجمند نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ عورت کالی تھی؟ اس سے مجھے پتا چلا کہ میں نے ”گھوڑے“ کے بجائے ”گورے“ کہا ہو گا۔ یعنی ایک بہت عام لفظ کے تلفظ میں مجھ سے ایک نہیں، دو غلطیاں ہوئیں۔ میرا ردِ عمل یہ تھا کہ مجھے شرم آئی چاہیے، لیکن پھر فوراً ہی یہ محسوس کیا کہ غالب کی طرح مجھے بھی شرم نہیں آتی۔ اس لیے کہ ایسے موقعے پر شرم محسوس کرنا فضول ہے۔ اپنی غلطی کا احساس اور یہ پکا ارادہ کرنا کہ اب ایسا نہیں کروں گا، دوسری بات ہے۔

میں نے اور ارجمند نے ۹ جون کو پہلو بہ پہلو بیٹھ کر کام شروع کیا اور ترجمے پر نظرِ ثانی کا یہ کام ۲۹ جون کو مکمل ہوا۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ میرے گھر میں ٹھہری ہوئی تھیں، دن بھر اردو میں گفتگو ہوتی تھی۔ اس طرح اردو بولنے اور پڑھنے سے میں نے بہت سی نئی باتیں سیکھیں۔ اپنے اردو ترجمے میں انہوں نے بہت سے الفاظ استعمال کیے جن کو میں جانتا تھا لیکن اب قریب قریب بھول چکا تھا۔ اس طرح ان الفاظ کی یاد تازہ ہو گئی۔ پھر بہت سے الفاظ ایسے تھے جو میں نہیں جانتا تھا۔ بہت سی مثالوں میں سے جو میں دے سکتا ہوں، صرف تین مثالیں دے رہا ہوں — ”بیننا“، ”پڑکنا“، ”پوڑ۔“ ان تینوں الفاظ سے میں بالکل ناواقف تھا۔ ایک دفعہ وہ جب سونے کے لیے جا رہی تھیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آج میں گھوڑے بیچ کر سوؤں گی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہوتا ہے تو انہوں نے بتایا کہ بے فکری کی نیند سونے کو کہتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی سوداگر اپنے سارے گھوڑے بیچ کر، ہر فکر سے آزاد ہو جائے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ارجمند ایسے الفاظ استعمال کرتی ہیں جن کے بارے میں میرا خیال اب تک یہ رہا ہے کہ یہ الفاظ فصیح نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ”ایک دم“ (بالکل کے معنی میں) یا کسی گاڑی کو ”چالو“ کرنا، وغیرہ کے استعمال

کو میں عامیانہ سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ دونوں فصیح ہیں۔ (ارجمند کا خیال ہے کہ فصیح غیر فصیح کی بحث غیر ضروری ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں صرف بولتی ہوں اور غلط نہیں سمجھتی۔) اس پر مجھے یاد آیا کہ پلیٹس کی لغت میں جو بہت ہی عمدہ لغت ہے، اکثر لفظوں کے دو تلفظ دیے گئے ہیں: ایک فصیح اور ایک عامیانہ۔ پلیٹس کی لغت ۱۸۸۴ء میں مرتب ہوئی۔ اس کے پچاس سال بعد میں نے دیکھا کہ تقریباً وہ سارے تلفظ جنہیں پلیٹس نے عامیانہ قرار دیا تھا، اب فصیح ہو گئے ہیں، اور پلیٹس کا صحیح تلفظ اب متروک ہو چکا ہے۔

مجھے خوب معلوم ہے کہ ارجمند کے جانے کے بعد بہت سے الفاظ اور جملے جو میں نے ان سے سیکھے ہیں، میں پھر بھول جاؤں گا۔ لیکن کیا کیا جائے؟ یہ تو ایک ناگزیر بات ہے۔

[مسلسل]